جدید اردو نظم میں تانیثی شعور
اکیسویں صدی کے تناظر میں

راؤ محمد عمر
پی ایچ ڈی سکالر (اردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

FEMINIST CONSCIOUSNESS
IN MODERN URDU VERSE

Rao Muhammad Umar
PhD Scholar(Urdu)
GC University, Lahore

Abstract

Twenty-first century's modern Urdu poem depicts strong feminist consciousness and elaborates variety of topics and themes related to issues faced by women in this region. These poems deliver an impression of negation and condemnation against all those social and ethical codes of discriminative behaviour which try to seize women rights and freedom. This modern feminist trend in 21st century's Urdu poem, expresses high magnitude on the both ends of behaviors, on the one side it mourns on deprivation of women's basic rights and on the other, shows strong rebellious behavior against this gender discrimination.

Keywords:

اردو، نظم، اکیسویں صدی، احمد ندیم قاسمی، سرمد صہبائی، منصورہ احمد، ملتان، کوئٹہ

جدید اردو نظم بالخصوص اکیسیویں صدی کی اردو نظم میں عورتوں کے مسائل اور حقوق سے متعلق گہرا تانیثی شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔ گو عالمی ادب میں عورت ہمیشہ سے ہی بنیادی کردار کے طور پر موجود رہی ہے مگر ان کرداروں کی تخلیق اور عکاسی جن نظریاتی سانچوں اور سماجی چھاپ سازی (Social labeling) کے عمل کے زیرِ اثر ہوئی، اس نے ان نسوانی کرداروں کو معروضی قالب میں ڈھال کے رکھ دیا۔ ان کرداروں کی ''میں'' اور شناخت سطحیت پسند ادب کی تہہ میں کہیں دب کر رہ گئی۔ عالمی سیاسی تاریخ میں سیاسی و کاروباری معاملات میں ان کی مداخلت اور ان کا بنیادی عہدوں پر فائز ہوسکنا معیوب تصور کیا جاتا رہا۔ بطور انفرادی اکائی کے، معاشرے میں ان کا مقام و مرتبہ ہمیشہ ثانوی اہمیت کا حامل رہا۔ ان کے حقوق اور مقام و مرتبہ میں بہتری کا تعین انسانی سطح کی بجائے ماضی کی نسبت سے کیا جاتا رہا۔ جب انسانی وجود کی بات کی جاتی ہے تو اس میں مرد اور عورت کی تفریق ختم ہوجاتی ہے کیوں کہ بطور وجود برائے خود (Being for itslef)(۱) انسان اپنے احساس و شعور جیسے اوصاف کے باوصف دیگر مادی اور بے جان اشیا یعنی وجود بذاتِ خود (Being in itself) (۲) سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ مگر پاکستان کی طرح دنیا کے ترقی پذیر اور روایات میں ڈھلے ممالک اور معاشروں میں عورتوں کی آزادی اور شعوری سطح کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ انھیں تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی روایات پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انھیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان جبس زدہ معاشروں میں ان کی ذات مجروح ہو کر رہ جاتی ہے اور اسے پہلے سے متعین شدہ پیمانوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی میں لکھی جانے والی بیشتر نظمیں عورتوں کے انھی مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ماہ طلعت زیدی اپنی نظم ''بارود کی بُو'' میں جبس زدہ معاشرے میں رہنے والی عورتوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں کہ وابستہ ہوں واماندہ قبیلے سے مجھے
یہ بھی غم ہے کہ یہاں جینا ہی سیکھا کب تھا
ہم کہ پابندِ روایاتِ زمانہ تھے ابھی
وسعتِ فکر برتنے کا قرینہ کب تھا۔۔۔''(۳)

انسانی وجود آزادیٔ انتخاب سے تعبیر ہے۔ وہ اپنی مخصوص جذبی و فکری صلاحیتوں کے باوصف حیاتیاتی یکسانیت میں اپنی شناخت اور پہچان حاصل کرتا ہے۔ وہ تمام عمر اپنے زمانی و مکانی امکانات میں سے انتخاب اور چناؤ کے عمل سے گزرتا ہے۔ مگر تاریخ عالم میں ہمیشہ عورتوں کی اس آزادی اور حقِ انتخاب کے اس بنیادی فردی و انسانی حقوق کو سلب کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یہ استحصال فرد کے اندر دکھ، نیستی اور جبر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ استحصال دوہرے نظام کو جنم دیتا ہے اور لوگوں کے مابین موجود مساواتی وحدت کی فضا کو

مجروح کرتا ہے۔آج کے اس جدید دور میں بھی عورتیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔سوسائٹی میں ان کے حوالے سے الگ معیار قائم ہیں اور مردوں کوان سے استثنا حاصل ہے۔عورتوں سے متعلق انھی دوہرے معیارات کا اظہار کرتے ہوئے منصورہ احمد اپنی نظم ''گل بی بی ،میری گُل جاناں!'' میں عورتوں کی بے بسی اور لاچاری کی تصویر یوں پیش کرتی ہیں:

''۔۔۔کیا منظر تھا!
جرگے کے سردار نے پورا جرم سنایا
اور پہلا پتھر بھی اٹھایا
پھر تو سارے مجمعے پر وحشت طاری تھی
سب ہی پتھر مار رہے تھے
تم زخموں سے تڑپ رہی تھیں
اور اُدھر گز بھر دوری پر
قہوہ خانے مہک رہے تھے
سب کے چہرے بیگانہ تھے
تم پر ٹوٹے قہر سے یکسر بے بہرہ تھے

پھر تم نیچے لڑھک گئی تھیں
اپنے خون میں ڈوب گئی تھیں
''سی این این'' کے کیمرے
تم پر جھک آئے تھے
میں نے تم کو تھامنا چاہا
تو مذہب کا اک متوالا مجھ پر گرجا
اس کو چھوڑو
ایسی عورت کا مر جانا ہی بہتر ہے
گندی عورت بچ نکلی تو
گندی نسلیں پیدا کرے گی۔۔۔''(۴)

مردوں اور عورتوں کے حوالے سے دوہرے معیارات کے حامل اس معاشرے میں ان دونوں کے لیے غلط صحیح کے معیار الگ الگ ہیں۔ مرد کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کر لے اور اگر وہی کام عورت کر لے تو طوفان آ جاتا ہے، ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ آج بھی گندگی اور ناپاکی کے طعنے صرف اس کے ہی مقدر کا حصہ ہیں۔ کسی ایسے جرم کی پاداش میں جس کی سزا مرد اور عورت دونوں کو ملنی چاہیے، عورت کو ہی سنگسار کیا جاتا ہے۔ یہ سنگساری کا عمل پتھر برسائے جانے سے ہو یا حرفوں کے تیروں سے، یہ فقط عورت کا ہی نصیب ہے۔ اسی کے بطن سے گندی نسلیں پیدا ہوتی ہیں، جب کہ مرد یہ سب کچھ کر کے بھی پاکباز ہی رہتا ہے۔ انھی خیالات کا اظہار کرتی، ادیب سہیل کی نظم ''ردِّ تیرگی'' ملاحظہ ہو:

''عجیب یہ سرزمیں ہے
جو آج بھی قبیلوں میں منقسم ہے
قبیلہ اندر قبیلہ تقسیم سرزمیں کے
کروڑوں لوگوں کے فیصلے کا خدا ہے سردار
اس کے منہ سے نکلی ہر بات حرفِ آخر
یہ کس طرح کا معاشرہ ہے
کہ لاکھوں لوگوں پہ چند افراد ایسے حاوی
کہ اُن کے منہ سے یہ لاکھوں افراد بولتے ہیں
کُھلے زمانے میں
علم کی روشنی سے کوسوں ہی دور۔۔۔۔جیسے
وحوش کی طرح جی رہے ہیں
اور عورتیں اُن کی
یہاں، بہن ہوں کہ بیوی اور بیٹیاں ہوں سب
مدتوں سے کھونٹے کی گائیں ہیں، بکریاں ہیں
یہ اپنے مردوں کے پاؤں کی جوتیاں ہیں
۔۔۔۔حقوقِ نسواں ہیں سر برہنہ!۔۔۔''(۵)

دورِ حاضر میں جہاں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ، بلکہ بعض حوالوں سے یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ ان سے بہتر طور پر، کام کر رہی ہیں اور اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں وہیں ہمارے ملک کے پسماندہ علاقوں میں ابھی تک عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔ انھیں صلح صفائی کے لیے بطور مال استعمال کیا جاتا

ہے اور انھیں گھروں کی چار دیواری میں بھی آزادی کی سانس نہیں لینے دی جاتی، کیوں کہ انھیں ان کے جسموں کی کال کوٹھڑیوں میں ہی محبوس رکھا جاتا ہے۔ انھیں علم جیسے نور سے دور رکھا جاتا ہے اور مذہبی پابندیوں سے ہٹ کر بھی تہذیبی، ثقافتی اور خاندانی روایات کی بلی چڑھا دیا جاتا ہے۔ سوا کیسویں صدی کی نظم میں ان روایات واقدار سے بغاوت کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔

نسائی استحصال کے پیچھے پدرسری معاشروں میں پنپنے والی ان اخلاقیات اور روایات کا ہاتھ ہے جنھیں مرد قائم کرتے ہیں اور تشکیل دیتے ہیں۔ عورت ان کے لیے دل لگی کا سامان ہے اور افزائشِ نسل کی ایک کڑی بھی۔ لہٰذا اس کی وقعت انھی مقاصد کی تکمیل کرتے کرداروں تک محدود ہے۔ معشوقہ، زوجہ، والدہ اور کسی حد تک بہن کی شکل میں وہ اس کے لیے قابلِ قبول ہے، مگر انھی روایتی سانچوں میں ڈھلتی ہوئی جنھیں وہ خود بناتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اس نسائی استحصال کو اپنی نظم ''عورت'' میں بڑے احسن اور جامع انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

''وجود میرا کہیں ہے بھی، یا کہیں بھی نہیں
ادھر میں دعوتِ شرب وطعام کے ہمراہ
وہ ناگزیر ضرورت رہی ہوں، جس کے بغیر
ہر ایک عیش کی تقریب نامکمل ہے
ادھر میں چلتی ہوئی اک مشین کا پرزہ
جو گھس گیا ہو تو کوڑے کے ڈھیر کا حصہ
ادھر میں ملکہ عالم، کہ جس کے حسن کا سحر
شہنشہوں کو کھلونا بنائے رکھتا ہے
ادھر میں صبح سے تا صبح ایک خادمہ ہوں
کہ جس کا ہاتھ ذرا سا رُکے تو بارشِ سنگ
کچھ ایسے برسے کہ سب کچھ ادھیڑ کر رکھ دے
میں اس تضاد کی چکی میں پس رہی ہوں سدا
مرا وجود قیامت بھی اور مصیبت بھی''(٦)

دورِ جدید میں بھی جہاں عالمی سطح پر عورتوں کے حقوق اور برابری کو تسلیم کر لیا گیا ہے وہیں پاکستان سمیت دیگر پدرسری نظام کے حامل ممالک اور معاشروں میں آج بھی عورتوں کو نظریات اور روایات تلے زندہ درگور کرنے کی رسم روا ہے۔ دورِ جاہلیت کی نسبت آج انھیں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن نہیں کیا جاتا بلکہ پیدا

ہوتے ہی ان کے امکانات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، تا کہ وہ تمام عمر زندہ لاش کی طرح جیتی بھی رہے اور مردوں کے نام پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ دیو مالائی کہانیوں کی طرح جن میں جادوگر کی جان اس کے طوطے میں بند ہوتی ہے اور وہ اسے پنجرے میں قید کر کے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مرد حکمران معاشروں میں مرد اپنی عزت عورتوں میں بند کر دیتے ہیں اور اسے چار دیواری میں قید کر دیا جاتا ہے۔ سو مرد کی عزت اور غیرت اس کے اپنے وجود میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود جو مرضی کرتا پھرے اس کی عزت اور غیرت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مرد غالب سماج میں مردوں اور عورتوں کے لیے پروان پانے والے دوہرے معیارات عورت کی آزادی اور قوتِ فیصلہ کو بری طرح متاثر کرتے ہیں اور وہ کسی چیز اور وجود بذاتِ خود (Being in itself) کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وجیہہ وارثی کی نظم ''اجازت نہیں'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''۔۔۔ میں اوپر دیکھتا ہوں
وہ چھپ جاتی ہے پردے کے پیچھے
پیچھے ایک اور دنیا ہے
وہ پستول، گولی اور ملک الموت کے ساتھ رہتی ہے
اس کے سارے بھائی
اس کے نام کی گولی
بلا ناغہ پستول میں بھرتے ہیں
اور غیرت کی صفائی کرتے ہیں
رات ہوتی ہے
پلازہ روشن ہو جاتا ہے
اُس کے گھر میں روشنی نہیں ہوتی
اُسے کمرے میں روشنی کرنے کی اجازت نہیں
اندھیرے میں کیا ہوتا ہے
کسی کو معلوم نہیں
اُسے کبھی بولتے نہیں سنا
شاید گونگی ہے'' (۷)

پدرسری نظام کے حامل معاشروں میں ابتدا سے ہی عورتوں کی برابری کے حوالے سے ایک خاص قسم کا تعصب دیکھنے کو ملتا ہے۔آج بھی سماج میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے ہوئے ان کے جسمانی اور حیاتیاتی خواص کو ہی مدِّنظر رکھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں عورتوں سے متعلق قائم نظریات وتصورات کی روشنی میں، سماج انھیں جنسی تلذذ اور نسل بڑھانے کی ضرورت تک محدود کیے ہوئے ہے۔سو اس ضمن میں بات کرتے ہوئے سرمد سروش اپنی نظم "May Flies" میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''مئی کی مکھیاں دیکھو!
ابھی جھیلوں سے ابھری ہیں
ابھی وہ زندگانی سے ہیں پیوستہ
کوئی عجلت سی عجلت ہے!!
وگرنہ ناتمامی کب جنم لینے کی منزل تھی!!
ابھی تو منہ ادھورے تھے!!
ابھی تو پنکھ ناقص تھے!!
مگر اک روز کی مہلت اگر حصے میں آتی ہو
تو کیسے انتظارِ کاملیت ہو!
جوازِ کاملیت ہو!
بھلا وہ قوتِ پر کیا،
دہن کیا ہے
جوان کو مقصد اولیٰ میں حشوِ بے ضروری ہے
انہیں نہ پیٹ بھرنا ہے
نہ اڑ کر دور کی منزل کو بڑھنا ہے
فقط پیڑھی بڑھانی ہے
یہی کیا زندگانی ہے!!''(۸)

مئی فلائز آبی ذخائر کے نزدیک پائے جانے والے حشرات کی ایک قسم ہے جو اپنی بالغ عمری حاصل کرنے کے بعد بہت کم عرصہ زندہ رہتی ہیں۔انھیں ایک دن کی مکھی (One day Fly) بھی کہا جاتا ہے۔ادب میں یہ زیست کی عارضیت اور زندگی کے مختصر دورانیے کی علامت سمجھی جاتی ہیں مگر اس نظم کے تناظر میں یہ اپنے اصطلاحی معنی کے ساتھ ساتھ علامتی طور پر عورتوں کے مسائل اور استحصال کی طرف بھی اشارہ کرتی

دکھائی دیتی ہے۔ دورِقدیم سے لے کر دورِ جدید تک عورتوں کی صورتِ حال مجموعی طور پر گراوٹ اور استحصال کا شکار رہی ہے۔ تہذیبِ نو اور دورِ حاضر میں بھی ان کا کام فقط پیڑھی کو آگے بڑھانا ہی ہے۔ مختلف ادوار میں ان کے عروج اور مساوی حقوق کی داستان بہت مختصر وقفوں تک محدود رہی ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں ہزاروں سال پہلے بھی انھیں وراثت کے حقوق حاصل تھے مگر وہاں بھی ان کے امکانات کو سلب کرنے کے لیے مرد نے نت نئے حیلوں سے کام لیا۔ بہن بھائیوں کی باہمی شادیوں کے ذریعے مردوں نے ان کی وراثت کو خاندان سے باہر جانے سے روکنے کی راہ نکال لی۔ اس کے علاوہ دسویں سے بیسویں صدی عیسوی تک چین کے مختلف علاقوں میں چھوٹے پاؤں (Small feet) یا لوٹس فیٹ (Lotus feet) کی رسم بھی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں عورتوں کے پاؤں کو چھوٹے چھوٹے سانچے نما جوتوں میں مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا جاتا، جس سے ان کے پاؤں کی ساخت تبدیل ہونا شروع ہو جاتی۔ اس عمل کی شروعات کی کوئی معینہ عمر وضع نہیں تھی پر عموماً یہ عورتوں کی اوائلِ عمری سے ہی شروع کر دیا جاتا۔ اس طویل دورانیے پر محیط انتہائی تکلیف دہ عمل میں ان کے پاؤں کی انگلیاں مڑ جاتی اور پاؤں کی ساخت بدل جاتی۔ اس سماج میں ان چھوٹے پاؤں کو حسن کی علامت سمجھا جاتا۔ اور مرد شادی کے لیے دیگر خواص کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر اس خصوصیت کا بھی تقاضا کرتے۔ تین انچ (3 inch) یا سات اعشاریہ چھ سینٹی میٹر (7.6 cm) کے پاؤں کو مثالی سائز تصور کیا جاتا۔ اس قدر چھوٹے پاؤں ہونے کی وجہ سے انھیں چلنے پھرنے میں بھی دقت کا سامنا ہوتا۔ اسی وجہ سے وہ گھروں تک محصور رہنے پر مجبور رہتی اور انھیں اپنے گھر والوں اور اپنے شوہروں انحصار کرنا پڑتا۔(۹) انھی رسوم کی طرح آج بھی مختلف بہانوں اور حیلوں سے ان کے امکانات کو سلب کرنے کی روایت موجود ہے۔ کبھی تہذیبی روایات کی شکل میں، کبھی مذہبی نظریات کی شکل میں اور کبھی خاندانی اقدار کی شکل میں۔

تیسری دنیا کے ترقی پزیر اور غریب ممالک اور معاشروں میں بسنے والے مردوں کی نسبت، عورتوں کی حالت زیادہ کربناک ہے۔ جہاں یہ امورِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کر کے اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ توّہم پرست، پدرسری نظام اور دقیانوس روایات کے حامل ان معاشروں میں یہ دہری اذیت کا شکار ہوتی ہیں کیونکہ اس غریب طبقے کی اخلاقیات ایسی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں جو ان کی آزادی، مرضی اور عزتِ نفس کو مجروح کر کے رکھ دیتی ہے اور حالات کی سختیاں، زندگی کی کٹھنائیاں اور عمومیت کی پرچھائیاں ان کی نسوانیت، خوابوں اور حسن کو پھیکا کر دیتی ہیں۔ بطور وجود، تیسری دنیا کے ان غریب طبقات سے تعلق رکھنے والی عورت کے محدود امکانات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالتی ہوئی ضیاء الحسن کی نظم ''کنیز فاطمہ سے محبت کی جا سکتی ہے!'' ملاحظہ ہو:

''کنیز فاطمہ!/اگر تم عبدالکریم کے گھر پیدا نہ ہوتیں
تو کپاس چننے کے بجائے/ کسی کالج میں پڑھا رہی ہوتیں
حقوقِ نسواں کی علم بردار کسی انجمن کی صدر ہوتیں/یا کہیں محل نشیں
تمھارے اردگرد ملازموں کی فوج ہوتی/تمھارا بدن پھولوں کی طرح مہکتا
تم ہیرے جواہرات سے سج رہی ہوتیں/تمھارے ایک اشارۂ ابرو پر
گردنیں کٹنے کو تیار ہوتیں/تمھاری چاہ میں کون کون نہ آہیں بھرتا پھرتا
کنیز فاطمہ!/تمھارے ہاتھ پانو یوں تڑخے ہوئے نہ ہوتے
تمھارے پسینے سے گوبر اور چارے کی بو نہ آتی/تمھارا لباس بدرنگ اور میلا نہ ہوتا
تم گندم کاٹتے اور کپاس چنتے ہوئے/عظیم تو لگتی ہو، حسین نہیں
تم سے ہمدردی تو کی جاسکتی ہے، محبت نہیں''(۱۰)

ان ممالک میں عورت کو درپیش مسائل میں سب سے اہم اور توجہ طلب مسئلہ جنسی استحصال ہے۔ تنگ نظریات کے حامل شہروں میں اقدار و روایات کی بیڑیوں میں جکڑی اس صنفِ مظلوم کی حالت آج بھی مردوں کے لیے سامانِ تعیش ہی ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ اور جدید نظریات کے حامل معاشروں میں بھی اسے مخصوص نظریات کی اوٹ میں استحصال اور بے حرمتی کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ عالمی منڈی کے اس جدید تصور میں اسے صارفین کو متوجہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ آج بھی ان کی قیمت لگائی جاتی ہے اور اس کے حسن کو زینت بنا کر ناظرین کو محظوظ کیا جاتا ہے۔ انھیں مصنوعات کی تشہیر (Advertisement) کے لیے بطور آلہ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ اس عمل کے لیے ایسے نظریات اور اخلاقیات کو جنم دیا گیا ہے کہ عورتوں کا یہ استحصال مال و دولت، شہرت کی چکاچوند، ماڈلنگ اور ٹی وی انڈسٹری کے گلیمر کی آڑ میں چھپ جائے۔ صنعتی دور کی یہ اعلیٰ معیارِ زندگی کی سحر انگیزی (Modern Captivation) دراصل غلامی کی ایک جدید صورت ہے۔ وہ آج بھی اپنے جسم اور حسن سے مردوں کا دل لبھانے والا کھلونا ہے۔ وہ پیسوں کے عوض اپنی عریانی جسم بیچتی ہے مگر ہمیشہ کی طرح آج کے نظریات بھی اسے سانچوں میں ڈھال کر اسے اُس سے باہر دیکھنے سے روکتے ہیں۔ دانیال طریر اپنی نظم ''ایک اور اندھا کباڑی'' میں صارفی معاشروں میں ہونے والی صنفِ نازک کی اس تحقیر اور استحصال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں پہ اپنا کاروبار جمانا چاہتے ہو تو عورت بیچو
عورت سب سے مہنگے داموں میں بکتی ہے
وہ جس چیز کو چھو لیتی ہے سونا کر دیتی ہے

اس کی چھون کوڈ ھال بناؤ
جتنا چاہے مال بناؤ'' (۱۱)

طبقاتی نظام اور پدرسری نظام کی دہری چکی میں پستی مظلوم عورت امکانی محدودیت کا شکار ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح اس کی حدود متعین ہیں، وہ ان حدود و قیود کے اندر ہی اپنی ہستی کا سامان کرسکتی ہے۔ اسے اس قابل ہونے ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے حقوق کا تقاضا کر سکے۔ وہ اپنی دھن میں ان حالات کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر گزارا کرتی رہتی ہے۔ اسے ایسی اخلاقیات کا درس دیا جاتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ ان حالات کا شکوہ کرنے اور باغیانہ رویہ اپنانے کو معیوب تصور کرتی ہے اور اس لگے بندھے پیمانے کے مطابق زندگی گزارنے کو باعثِ فخر اور باعثِ فضیلت تصور کرتی ہے۔ انھی خارجی پابندیوں، تصورات اور اپنی حالتِ بے حال سے غفلت اور بیگانگی کے سبب آج کے اس جدید دور میں بھی عورتوں کی ایک بڑی تعداد اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم ہے۔

پاکستانی معاشرے میں تہذیب و روایات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت آج بھی اپنے حقوق کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ وہ یقینِ بد (Bad faith) کا شکار ہو کر ماں، بہن، بیوی جیسے روایتی کرداروں میں اپنے وجود کا اثبات تلاش کرنا چاہتی ہے۔ محبت کی ڈور سے بندھے ان رشتوں میں اس کا کردار روایتی پیمانوں میں ناپا اور تہذیبی، خاندانی اور مذہبی اقدار کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ عورت کے یہ مثالی کردار اس طرح تراشے جاتے ہیں کہ وہ عورت خود کو انھی مثالی کرداروں میں ضم کرنے کے لیے سرگرداں رہے۔ قربانی، وفا، حیا، کم گوئی، فرمانبرداری اور چاردیواری تک محدود رہنے جیسے اوصاف ان مثالی کرداروں کا خاصا ہیں اور یہی ایک مثالی، اچھی اور بری، بدکار عورت میں تمیز کے پیمانے ہیں۔ پدرسری نظام اور سخت گیر عقائد و نظریات کے حامل معاشروں میں تعینات اور تصورات کی قیدی عورتوں کے مسائل کو حمیدہ شاہین کی اس نظم'' میں ایک بار سر اٹھانا چاہتی ہوں'' میں کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''میری گردن میں موٹی زنجیر ہے/ مجھے منہ کے بل گھسیٹا جاتا ہے/ گلی گلی
شہر شہر/ رشتہ رشتہ/ شکوک و شبہات کی ریت میں
طعنوں کے پتھروں/ اور تہمت کے کانٹوں پر/ میری ناک ٹوٹ چکی ہے
آنکھوں میں ریت بھری ہے/ اور کانوں میں زنجیر کا شور ناچتا ہے/ مجھے ایندھن بنا دیا گیا ہے
میں خود کو جلا کر کھانے تیار کرتی ہوں/ سبزی کے ساتھ انگلیاں بھی کٹتی ہیں، دل بھی
آٹے میں آنسوؤں کا نمک گوندھ کر/ خود کو توے پر ڈالتی ہوں/ گوشت کے ساتھ بھونتی ہوں
نوزائیدہ خواب/ اور اپنا آپ/ تیز آنچ پر ابلتا ہے/ چھوٹا سا دل

مجھے سوختہ دیکھ کر / کس کی آنکھوں میں کیا رنگ اترتا ہے
سینے پر جھکے سر کے ساتھ کس طرح دیکھوں / میں اک بار سر اٹھانا چاہتی ہوں
میں دیکھنا چاہتی ہوں / کہ زنجیر کے دوسرے سرے پر کون ہے'' (۱۲)

ترقی پذیر، پسماندہ اور ترقی یافتہ، ہر طرح کے معاشروں میں ان مثالی کرداروں کے علاوہ بھی عورت کا ایک ناپسندیدہ کردار دیکھنے کو ملتا ہے اور وہ ہے طوائف اور فاحشہ کا کردار۔ یہ کردار ازمنۂ قدیم سے ہی مردوں کو عیش وعشرت کا سامان مہیا کرتا رہا ہے۔ عورت کے اس کردار اور تصور میں ڈھلنے کے پیچھے بہت سے محرکات کارفرما ہو سکتے ہیں مگر اس کا سب سے بڑا محرک غربت اور عورت کا مردوں پر انحصار اور بے مختاری ہے۔ دیگر کرداروں کی طرح عورت کا یہ کردار بھی عورت بطور انسانی وجود ان کے امکانات کو محدود کرتا ہے اور معاشرے میں اس کی فردی شناخت، طوائف اور فاحشہ کی شناخت میں ڈھل جاتی ہے۔ عورت کا یہ ناپسندیدہ کردار مردوں کی جنسی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور مسلسل ذہنی وجسمانی سطح پر تشدد کا شکار رہتا ہے۔ دوہرے معیار کے حامل ان معاشروں میں اس سے جنسی تسکین حاصل کرنے والوں کے نام پر کوئی حرف نہیں آتا مگر وہ خود ایک کم تر مخلوق کی طرح زندگی بھر لوگوں کے عتاب کا شکار رہتی ہے۔ سرمد صہبائی اپنی نظم ''مرے واسطے میرا مرنا بھی فن ہے'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''میں بانجھ روحوں میں بادل کی صورت میں برستی ہوں
سنسان آنکھوں میں اک کھنکھناتا ہوا خواب
بہتے اندھیرے کے بستر پر
شہوت کی ٹھہری ہوئی جھاگ ہوں
لوگ مرتے ہیں
لیکن میرے واسطے میرا مرنا بھی فن ہے
کبھی ٹیکسیوں، سینماؤں کے تاریک کونوں میں
فٹ پاتھ کی دھندلی گمنامیوں میں
کرائے کے کمروں میں
پھولوں کے بوسیدہ ہاروں کے نیچے
میں آہستہ آہستہ مرتی ہوں
ہر رات اک گیلی لکڑی کی صورت سلگتی ہوں
بکھری ہوئی راکھ سے

دوسرے دن نیا جسم لے کر نکلتی ہوں
منہ زور مردوں کو
تالو سے لپٹی ہوئی تھوک کی طرح اندر نگلتی ہوں'' (۱۳)

تہذیبی و معاشرتی ارتقا نے عورت کو ہمیشہ چند امکانات سے ہی نوازا ہے۔کل بھی وہ چار دیواری میں قید ماں، بہن، بیٹی اور چار دیواری سے باہر بد چلن، طوائف اور مردوں کے لیے سامانِ تعیش میں سے کسی ایک کا چناؤ کر سکتی تھی اور آج بھی اسے انھی امکانات میں سے کسی ایک کا چناؤ کرنا پڑتا ہے۔زیادتی، اغوا اور تشدد کی روایات دورِ جاہلیت میں بھی اس کا نصیب تھیں اور آج دورِ جدید اور روشن خیالی میں بھی اسے ان ہی کا سامنا ہے۔بچپن سے ہی اس کے امکانات کا گلا گھونٹے جانے کی وجہ سے، کسی نامساعد حالات میں ان کے لیے اپنی ضروریات کے حصول کے واسطے جسم فروشی جیسے امکانات ہی موجود ہوتے ہیں۔گھروں سے لے کر دفتروں میں کام کاج تک ان کا جنسی استحصال اور انھیں جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات معمول کی بات ہیں۔آج بھی یورپ جیسے ترقی یافتہ معاشروں میں زیادتی اور ریپ کی شرح سب سے زیادہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں مردوں کے لیے عورت کا مقام و وقعت فقط جنسی تلذذ اور ضرورت کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور انھیں بس اسی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ان کا تشخص اور مقام و مرتبہ آج بھی ایک شعوری وحساس وجود کی نگاہ سے دیکھے جانے کا منتظر ہے۔ان کی تفہیم جن جنسی زاویوں اور جن سطحی حواس سے کی گئی ہے اس کی رو سے یہ واقعی صنفِ نازک ہی ہے۔ وگرنہ ارتقائے آدمیت میں کیا عورتوں نے مردوں سے کم نامساعد اور ناسازگار حالات جھیلے ہیں؟ اور کیا انھوں نے مردوں کی نسبت ان حالات میں اپنے ساتھ ساتھ اپنی کوکھ اور گود میں پنپتی دوسری زندگی کو نہیں بچایا؟

سعادت سعید اپنی نظم ''مظلوم'' میں روزِ ازل سے مظلومیت کا شکار عورت کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مظلومیت روزِ اول سے عورت پر مسلط ہے
ترتیب بدلتا رستہ دریافت نہیں گیا
ماں، بہن بیوی، محبوبہ، طوائف، نائکہ مظلومیت کے روپ ہیں
ڈوبتا سورج، امنڈی گھٹا، دور جاتی کشتیاں، بسیرا لیتے پرندے،
بے سہارا عورت، دکھ بوجھ سے دبی، گود بچہ اٹھائے
ساحل پر انجانی منزل کی آس لیے
صبح انتظار رہی ہے۔۔۔'' (۱۴)

سعادت سعید اپنی درج بالا نظم میں عورتوں کے محدود امکانات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی حالتِ بے حال کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے متعین کردہ مختلف تصورات کی روشنی میں ماں، بہن، بیٹی، بیوی، محبوبہ، نائکہ اور طوائف میں سے کسی ایک کا چناؤ کر سکتی ہے۔ پہلے سے متعین ان کرداروں کے سانچوں میں ڈھل کر کسی کردار کا چناؤ کرتے ہوئے اسے اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے کی سماج میں اس کردار کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے اس چناؤ پر بھی مرد غالب سماج کے اثرات واضح طور پر دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انھی اثرات کے زیرِ اثر، زمانے کی نظر میں ناپسندیدہ سمجھے جانے والے کردار کو نبھاتی عورت کی بے بسی اور لاچاری کو بیان کرتی ہوئی علی محمد فرشی کی نظم ''آخری منت'' ملاحظہ ہو:

''زانیہ نے / درد کی شلوار بدلی / آنسوؤں سے روح کا چہرہ بھگویا
دل کا گندا زخم دھویا / سرخ پھولوں پر سجائی آرزو / نوگزے بابا کے مرقد پر
یہ اُس کی آخری مَنت کی رات / اِس طرح بھاری تھی اُس پر / جیسے ڈائن کو
کلیجا اپنے بیٹے کا چبانا پڑ گیا ہو / آخری مَنت ہے بابا / اس سے پہلے جتنی بار آئی ہوں میں
خالی دامن لوٹ کر جاتی رہی ہوں / گندگی کے مست مکھے / میرے تن پر بھنبھناتے ہی رہے
میں روٹی کی مجاور / کاش تیرے در کی مٹی چاٹ سکتی / زندگی کا خونی دریا پاٹ سکتی
گندگی کی کیڑیاں ہم / آسمانوں سے نہیں آئیں مگر / جائیں گی واپس اُدھر ہی
جس طرف ہر پاک باز / پاک باز اک آدمی کی / میں نے کتنی منتیں مانی تھیں بابا، یاد ہے؟
آرزو ہے / آرزو یہ ہے کہ بابا / آخرت میں
ان پلیدوں سے کہیں بھی سامنا میرا نہ ہو / وہ اگر جنت میں جائیں /
تو مجھے دوزخ قبول!''(۱۵)

اکثر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ دنیا میں لڑائی جھگڑے اور فساد کی تین وجوہات ہیں اور تاریخِ عالم میں ہونے والے تمام کشت و خون کا سبب زر، زن اور زمین ہے۔ زر اور زمین کے پیچھے احساسِ ملکیت اور وسائل پر قبضہ جمانے جیسے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے تاریخِ انسانی اس مفروضے پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی دکھائی دیتی ہے کہ زر اور زمین کی طرح زن کے ساتھ بھی مرد کا احساسِ ملکیت جڑا ہوا ہے۔ فاتحین اسے بطور مالِ غنیمت اپنے ساتھ لے جاتے اور وہ فاتحین میں دیگر مال کی طرح بانٹی جاتیں۔ بادشاہ اپنے دوست ممالک اور سلطنتوں کے فرمانرواؤں اور راجاؤں کے پاس اسے دیگر تحائف کے ساتھ بطور تحفہ بھیجتے۔ بادشاہوں اور امرا کے خزانوں کی طرح ان کے حرم بھی عورتوں سے بھرے ہوتے۔ باڑے میں رکھی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور حرم میں بسنے والی عورتوں میں فرق صرف ماحول کا ہوتا۔ یہ گھر میں رکھ کر بھولی ہوئی بیکار

چیزوں کی طرح حرم کی زینت اور سامانِ تفاخر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھیں۔ انسانی غلامی اور انسان فروشی کا دور ختم ہوا تو انھیں بندی بنانے کے جدید طریقے ایجاد کر لیے گئے لیکن آج بھی ان کی وقعت و قیمت ویسی ہی ہے جیسی کہ پچھلے ادوار میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی عورت اپنے حقوق اور خود سے جڑے نا منصفانہ نظریات کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ثمینہ تبسم انھی نا منصفانہ نظریات کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے اپنی نظم ''میں بے چاری نہیں''، میں لکھتی ہیں:

''اکیسویں صدی کا سارا بوجھ
اپنے داہنے ہاتھ کی
انگشتِ شہادت پر اُٹھائے
میں تمھیں خبردار کرتی ہوں
مجھ پہ بدکرداری کا الزام لگا کر
سنگسار کرنے کی جرأت کرنے سے پہلے
اپنی بُزدلی کا غُصہ مجھ پہ نکال کر
بکریوں کی طرح ونی کرنے
اور جائیداد ہتھیانے کے لیے
قرآن سے شادی کر دینے سے بہت پہلے
خود کو قتل کی سزا سے بچانے کے لیے
مجھے تاعمر غُلامی کا پھندا پہنانے کے لیے
تمھیں اپنا کردار ثابت کرنا ہوگا
اب اگنی پرکھشا میری نہیں
تُمہاری ہوگی
میں ایک ماں
اپنی بیٹیوں کے تحفظ کی قسم کھاتی ہوں!''(۱۶)

برصغیر پاک و ہند میں عورتوں کے حقوق اور برابری سے متعلق نظریاتی ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اس کے ساتھ ملکیت کا گہرا شعور جڑا ہوا ہے۔ خاوند کی موت پر اسے چِتا کے ساتھ زندہ جلا کر ستی کر دیا جاتا، بالکل اسی طرح جیسے دیگر تہذیبوں بالخصوص قدیم مصری تہذیب میں بادشاہوں اور فرعونوں کے ساتھ ان کے استعمال کی چیزوں اور زیورات کو بھی مقبرے میں دفنا دیا جاتا۔ کل کی طرح آج بھی ان کے وراثتی حق کو سلب کرنے

کے لیے مختلف حیلے بہانے تلاش کیے جاتے ہیں۔قدیم مصر میں وراثت کو کسی دوسرے کے پاس جانے سے روکنے کے لیے بہن بھائیوں کی باہمی شادی کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے ہمارے ہاں بھی ان کی شادیاں قرآن کے ساتھ کروا کر وراثت کو گھر میں ہی رکھ لیا جاتا۔آج بھی انھیں بطور دیت اور لڑائی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ونی کر دیا جاتا ہے۔ان تمام حالات کے اندر عورت کے امکانات اور اس کی آزادی کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے لہٰذا وجودی نقطہ نظر سے وہ مال مویشی کی سی حیثیت سے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

عورتوں کو درپیش انھی مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی عالیہ مرزا کی نظم ''سناٹا چیخ اٹھتا ہے'' ملاحظہ ہو:

''ہوا لال اینٹوں کی گلیوں سے گزرتی / سیلن زدہ کوٹھڑیوں میں بچے جنتی ہے / گھٹی گھٹی سانسیں لیتی ہوئی

جب باہر نکلتی ہے / تو ٹھنڈ سے کُبڑی ہو چکی ہوتی ہے / سیدھا چلنے کی خواہش میں

اونچے نیچے رستوں پر / گھوڑوں کے سموں تلے / کیچڑ میں لت پت سر پٹختی

اٹھنے کی کوشش کرتی ہے / اور رینگتے رینگتے کسی حویلی میں جا گھستی ہے / جہاں رات کا سناٹا بین کر رہا ہوتا ہے

قدموں کی مانوس سی چاپوں سے / حویلی کے سناٹوں میں / گونج کی دراڑیں پڑنے لگتی ہیں

ہوا کسے ڈھونڈتی ہے؟ / وہ جانتی ہے کہ پٹاروں میں اجداد کے فن کا لوہا / صندوقوں میں بھرا پڑا ہے

پُرکھوں کے افکار، / شیلفوں پر قرینے سے سجے ہیں / ایک بڑے کمرے میں گول میز پر

کروشیے سے کاڑھے ہوئے رومال میں / اس نے اپنی آنکھیں بھی کاڑھ دی ہیں / وہ روتی ہوئی

رومال میں کاڑھی ہوئی آنکھوں کو چومتی ہے / اور حویلی کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی

آخری نشانی تلاش کر رہی ہوتی ہے کہ سناٹا چیخ اٹھتا ہے!''(۱۷)

بے خواہشی کا جیون اور بن مرضی کا انتخاب بطور صنف عورت کا المیہ ہے اور دورِ حاضر کی یہ جدید تانیثی روا اپنے مقاصد اور اہداف میں بہت واضح اور شدید ردِ عمل کے طور پر ابھری ہے۔اکیسویں صدی نظم کی ہیئتی اقسام نے عورتوں کے مسائل کو بہتر انداز میں پیش کرنے کا موقع فراہم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس صدی میں لکھی جانے والی نظموں میں عورتوں کو درپیش مسائل اور ان مسائل کے پیچھے کارفرما اخلاقی و سماجی اقدار اور نظاموں پر کڑی تنقید اور ان کے خلاف باغیانہ رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ جدید تانیثی رو پدرسری نظام کے حامل معاشروں میں نہ صرف مردوں کے برابر مساواتی حقوق کا تقاضا کرتی ہے بلکہ اس سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے بنیادی انسانی حقوق کے لیے سرگرم ہے۔بلاشبہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جدید نظم نگاروں نے تانیثی نقطہ نظر سے عورتوں کی حالتِ زار کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ان کا مقدمہ جامع دلائل کے ساتھ بڑے احسن انداز میں میں لڑا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Gill, Richard And Sherman, Ernst. ed. The Fabric of existentialism (Philosophical and literary sources). New Jersey: Pentice Hall, inc,1973. P-20

(2) The Fabric of Existentialism. P-20

(۳) ماہ طلعت زاہدی، روپ ہزار، ملتان: کتاب نگر،۲۰۰۲،ص ۱۵

(۴) منصورہ احمد، گُل بی بی، میری گُل جاناں!، مشمولہ: فنون، سہ ماہی، شمارہ ۱۲۴، لاہور: میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ، جنوری تا اپریل ۲۰۰۰،ص ۹۷

(۵) ادیب سہیل، ردِ تیرگی، مشمولہ: فنون، سہ ماہی، شمارہ ۱۱۹، لاہور: میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ، جنوری تا اپریل ۲۰۰۳، ص ۱۱۴

(۶) احمد ندیم قاسمی، عورت، مشمولہ: معاصر، جلد ۵، ۶، شمارہ ۷، ۸، ۹، لاہور: ۶/۱۳ سی گلبرگ ہائیٹس وارث روڈ، جولائی ۲۰۰۵ء تا مارچ ۲۰۰۶ء،ص ۳۳۱

(۷) وجیہہ وارثی، اجازت نہیں، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء،ص ۲۱۱

(۸) سرمد سروش، May-Flies، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۱۳، فیصل آباد: نقاط مطبوعات، مئی ۲۰۱۵ء،ص ۱۶۲

(9) Fairbank, john king, The Great Chinese Revolution, 1800-1985. New york: Harper & Row, 1986. p-70

(۱۰) ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۷،ص ۲۱

(۱۱) دانیال طریر، معنی فانی، کوئٹہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۱۲،ص ۱۱۲

(۱۲) حمیدہ شاہین، زندہ ہوں، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱۰ء،ص ۱۷۵

(۱۳) سرمد صہبائی، میرے واسطے میرا مرنا بھی فن ہے، مشمولہ: نقاط، فیصل آباد، اسلام آباد: نقاط مطبوعات، جون ۲۰۱۰ء،ص ۳۱۳

(۱۴) سعادت سعید، مظلوم، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء،ص ۲۷۰

(۱۵) علی محمد فرشی، آخری منت، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۱۱، فیصل آباد: نقاط مطبوعات، دسمبر ۲۰۱۲ء،ص ۲۴۹

(۱۶) ثمینہ تبسم، بس بے چاری نہیں، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء،ص ۲۳۰

(۱۷) عالیہ مرزا، سناٹا چیخ اٹھتا ہے، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۲، جہلم: بک کارنر، اگست ۲۰۱۷ء،ص ۴۱۷